میں صرف قولی جواب اور مناظرہ پر اکتفا نہ کیا جاوے گا، بلکہ مثل کفار سابقین عملی سزا بھی دی جاوے گی، خواہ دنیا میں بھی یا صرف آخرت میں، آگے دوسرے جواب دینے کے لئے ارشاد ہے کہ، آپ (ان سے) کہئے کہ کیا تمہارے پاس (اس مقدمہ پر کہ صدور کی قدرت دینا مستلزم رضا ہی ہے) کوئی دلیل ہے (اگر ہے) تو اس کو ہمارے روبرو ظاہر کرو (اصل یہ ہے کہ دلیل وغیرہ کچھ بھی نہیں)، تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور تم بالکل اٹکل سے باتیں کرتے ہو (اور دونوں جواب دے کر) آپ (ان سے) کہئے کہ بس (دونوں جوابوں سے معلوم ہوا کہ) پوری حجت اللہ ہی کی رہی (اور تمہاری حجت باطل ہوگئی) پھر (اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ تم سب راہ پر آجاتے مگر اس کی توفیق خدا ہی کی طرف سے ہے) اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہ (راست) پر لے آتا (مگر حق تعالیٰ کی بہت سے حکمتیں ہیں، کسی کو توفیق دی کسی کو نہیں دی، البتہ اظہارِ حق اور اعطاءِ اختیار و ارادہ سب کے لئے عام ہے، آگے دلیل نقلی کے مطالبہ کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) آپ (ان سے) کہئے کہ (اپنی دلیل عقلی کا حال تو تم کو معلوم ہوا اچھا اب کوئی صحیح دلیل نقلی پیش کرو مثلاً) اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس بات پر (باقاعدہ) شہادت دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان (مذکورہ) چیزوں کو حرام کر دیا ہے، (باقاعدہ شہادت وہ ہے جو مبنی ہو مشاہدہ پر یا ایسی دلیل قطعی پر جو افادہ یقین میں برابر ہو مشاہدہ کے، جیسا کہ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اس طرف مشیر ہے) پھر اگر (اتفاق سے کسی کو فرضی جھوٹے گواہ بنا کر لے آویں اور) وہ (گواہ اس کی) گواہی (بھی) دیدیں تو (چونکہ وہ شہادت یقیناً بے قاعدہ اور محض سخن سازی ہوگی، کیونکہ مشاہدہ بھی مفقود اور مشاہدہ کا مماثل بھی مفقود، اس لئے) آپ اس شہادت کی سماعت نہ فرمائیے اور (جب ان کا مکذب ہونا جیسا کہ وَلَا حَرَّمْنَا اور كَذٰلِكَ كَذَّبَ الخ دال ہے اور منکر آخرت ہونا جیسا بہت سی آیات دال ہیں اور مشرک ہونا جیسا اَشْرَكْنَا دال ہے، ثابت ہو گیا تو اے مخاطب) ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا جن کا بطلان ابھی ثابت ہو چکا، اتباع مت کرنا جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (اور اسی سبب سے نڈر ہو کر حق کی تلاش نہیں کرتے)، اور وہ (استحقاقِ معبودیت میں) اپنے رب کے برابر دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں (یعنی شرک کرتے ہیں)۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ

تو کہہ تم آؤ میں سنا دوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے کہ شریک نہ کرو اس کے

شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ

ساتھ کسی چیز کو، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور مار نہ ڈالو اپنی اولاد کو

اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ

مفلسی سے ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو اور پاس نہ جاؤ بے حیائی کے کام

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ

کے جو ظاہر ہو ان میں سے اور جو پوشیدہ ہو اور مار نہ ڈالو اس جان کو جس کو حرام کیا ہے اللہ نے

اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿١٥١﴾ وَلَا

مگر حق پر تم کو یہ حکم کیا ہے تاکہ تم سمجھو اور پاس نہ

تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ

جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طرح سے کہ بہتر ہو یہاں تک کہ پہنچ جاوے اپنی جوانی کو

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا

اور پورا کرو ماپ اور تول کو انصاف سے ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں

وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ

جس کی اس کو طاقت ہو اور جب بات کہو تو حق کی کہو اگرچہ وہ اپنا قریب ہی ہو اور اللہ کا عہد

اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٥٢﴾ وَاَنَّ

پورا کرو تم کو یہ حکم کر دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو ، اور حکم کیا کہ

هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

یہ راہ ہے میری سیدھی سو اس پر چلو ، اور مت چلو اور رستوں پر

فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ

کہ تم کو جدا کر دیں گے اللہ کے راستے سے یہ حکم کر دیا ہے تم کو تاکہ

تَتَّقُوْنَ ﴿١٥٣﴾

تم بچتے رہو

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان سے) کہئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں یہ ہیں کہ ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (یعنی شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور (دوسرے یہ کہ) ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس ان کے

بُری طرح رہنا حرام ہوا) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب (جیسا کہ جاہلیت میں غالب عادت تھی) قتل مت کیا کرو (کیونکہ) ہم تم کو اور انکو (دونوں کو) رزق (مقدر) دیں گے (وہ تمھارے رزق مقدر میں شریک نہیں ہیں، پھر کیوں قتل کرتے ہو، پس قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہوں (اور) خواہ پوشیدہ ہوں (وہ طریقے یہی ہیں) اور (پانچویں یہ کہ) جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق (شرعی) پر (قتل جائز ہے مثلاً قصاص میں یا رجم میں، پس قتلِ ناحق حرام ہوا) اس (سب) کا تم کو (اللہ تعالیٰ نے) تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف مت کرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہو جو کہ (شرعاً) مستحسن ہو (مثلاً اس کے کام میں لگانا، اس کی حفاظت کرنا، اور بعض اولیاء اور اوصیاء کو اس میں یتیم کے لئے تجارت کرنے کی بھی اجازت ہو) یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ بلوغ کو پہنچ جاوے (اس وقت تک ان تصرفاتِ مذکورہ کی بھی اجازت ہو) اور پھر اس کا مال اس کو دیدیا جاوے گا بشرطیکہ سفیہ نہ ہونے کے، پس تصرف غیر مشروع مالِ یتیم میں حرام ہوا) اور (ساتویں یہ کہ) ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو، انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے، اور نہ آوے، پس اس میں دغا کرنا حرام ہوا) اور یہ احکام کچھ دشوار نہیں کیونکہ) ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف (بھی) نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی کیوں کی جاوے) اور (آٹھویں یہ کہ) جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق کوئی) بات کیا کرو تو (اس میں) انصاف (کا خیال) رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہنی ہے ہو تمھارا) قرابت دار ہی ہو (پس خلافِ عدل حرام ہوا) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو (جیسے قسم یا نذر بشرطیکہ اس کے مشروع ہونے کے) اس کو پورا کیا کرو (پس اس کا عدمِ ایفاء حرام ہوا) ان (سب) کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو (اور عمل کرو) اور یہ (بھی کہہ دیجئے) کہ (کچھ انھیں احکام کی تخصیص نہیں بلکہ) یہ دین (اسلام اور اس کے تمام احکام) میرا رستہ ہے (جس کی طرف میں باذنِ الٰہی دعوت دیتا ہوں) جو کہ (بالکل) مستقیم (اور راست) ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے — (جس کی طرف میں دعوت کرتا ہوں) جدا (اور دور) کر دیں گی، اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے، تاکہ تم (اس راہ کے خلاف کرنے سے) احتیاط رکھو۔

معارف و مسائل

ان آیات سے پہلے تقریباً دو تین رکوع میں مسلسل یہ مضمون بیان ہو رہا ہے کہ غافل اور جاہل انسان نے زمین و آسمان کی ساری چیزوں کے پیدا کرنے والے حکیم الحاکمین کا نازل کیا ہوا قانون چھوڑ کر آبائی اور من گھڑت رسموں کو اپنا دین بنا لیا، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تھا انکو جائز سمجھ کر استعمال کرنے لگے، اور بہت سی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا تھا ان کو اپنے اوپر حرام کر لیا، اور بعض چیزوں کو مردوں کے لئے جائز عورتوں کے لئے حرام، بعض کو عورتوں کے لئے حلال مردوں کے لئے حرام قرار دیدیا۔

ان تین آیتوں میں اُن چیزوں کا بیان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، تفصیلی بیان میں نو چیزوں کا ذکر ہے، اس کے بعد دسواں حکم اس طرح بیان فرمایا گیا کہ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ، یعنی یہ دین میرا سیدھا راستہ ہے، اس پر چلو، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اور بتلائے ہوئے دین و شریعت کی طرف اشارہ کر کے تمام حلال و حرام اور جائز و ناجائز، مکروہ و مستحب چیزوں کی تفصیلات کو اس کے حوالہ کر دیا کہ شریعتِ محمدیہ نے جس چیز کو حلال بتلایا اس کو حلال اور جس کو حرام قرار دیا اس کو حرام سمجھو، اپنی طرف سے حلال و حرام کے فیصلے نہ کرتے پھرو۔

پھر جن دس چیزوں کا تفصیلی بیان ان آیات میں آیا ہے ان میں اصل مقصد تو حرام چیزوں کا بیان کرنا ہے، جس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ ان سب کو بصیغۂ نہی ممانعت کرنے کے عنوان سے بیان کیا جاتا، لیکن قرآن کریم نے اپنے خاص حکیمانہ اسلوب کے ماتحت ان میں سے چند چیزوں کو ایجابی طور پر بصیغۂ امر بیان فرمایا ہے، اور مراد یہ ہے کہ اس کے خلاف کرنا حرام ہے (کشاف) اس کی حکمت آگے معلوم ہو جائے گی، وہ دس چیزیں جن کی حرمت کا بیان ان آیات میں آیا ہے یہ ہیں:۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت و اطاعت میں کسی کو ساجھی ٹھہرانا، والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرنا، فقر و افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینا، بے حیائی کے کام کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، یتیم کا مال ناجائز طور پر کھا جانا، ناپ تول میں کمی کرنا، شہادت یا فیصلہ یا دوسری کلام میں بے انصافی کرنا، اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستہ کو چھوڑ کر دائیں بائیں دوسرے راستے اختیار کرنا۔

آیات مذکورہ کی اہم خصوصیات کعب احبارؒ جو تورات کے ماہر عالم ہیں پہلے یہودی تھے، پھر

مسلمان ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی یہ آیات جن میں دس حرام چیزوں کا بیان ہے، اللہ کی کتاب تورات بسم اللہ کے بعد انھی آیات سے شروع ہوتی ہے (انتہیٰ) اور کہا گیا ہے کہ یہی وہ دس کلمات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہی وہ آیات محکمات ہیں جن کا ذکر سورۂ آلِ عمران میں آیا ہے کہ جن پر آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں متفق رہی ہیں ان میں سے کوئی چیز کسی مذہب وملت اور کسی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئی (تفسیر بحر محیط)

یہ آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصیت نامہ ہیں

اور تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے انھوں نے فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا وصیت نامہ دیکھنا چاہے جس پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہو تو وہ ان آیات کو پڑھ لے، ان میں وہ وصیت موجود ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی اُمّت کو دی ہے۔

اور حاکم نے بروایت حضرت عبادہ بن صامتؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو خطاب کر کے فرمایا "کون ہے جو مجھ سے تین آیتوں پر بیعت کرے" پھر یہی تین آیتیں تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا کہ "جو شخص اس بیعت کو پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو گیا"

اب ان دس چیزوں کا تفصیلی بیان اور تینوں آیتوں کی تفسیر دیکھئے؛ ان آیات کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ، اس میں تَعَالَوْا کا ترجمہ "آجاؤ" اور اصل میں یہ کلمہ ایسے وقت بولا جاتا ہے جبکہ کوئی بلانے والا بلند جگہ کھڑا ہو کر نیچے والوں کو اپنے پاس بلائے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس دعوت کو قبول کرنے میں ان لوگوں کے لئے برتری اور بلندی ہے، معنی یہ ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ آجاؤ تاکہ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سنا دوں جو اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کی ہیں، یہ بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا پیغام ہے، اس میں کسی کے ظن وتخمین یا قیاس کا دخل نہیں، تاکہ تم ان سے بچنے کا اہتمام کرو اور فضول اپنی طرف سے اللہ کی حلال چیزوں کو حرام کرتے نہ پھرو۔

اس آیت کا خطاب اگرچہ بلاواسطہ مشرکینِ مکہ کی طرف ہے، مگر مضمونِ خطاب عام ہے، اور تمام بنی نوع انسان کو شامل ہے خواہ مؤمن ہوں یا کافر، عرب ہوں یا عجم، اور موجودہ حاضرین ہوں یا آئندہ آنے والی نسلیں (بحر محیط)

۳۱

سب سے پہلا گناہ عظیم شرک ہے جس کو حرام کیا گیا ہے

اس اہتمام کے ساتھ خطاب کر کے محرمات وممنوعات کی فہرست میں سب سے پہلے یہ ارشاد فرمایا اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا، یعنی سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک اور ساجھی نہ سمجھو، نہ مشرکینِ عرب کی طرح بتوں کو خدا بناؤ، نہ یہود ونصاریٰ کی طرح انبیاء کو خدا یا خدا کا بیٹا کہو، نہ دوسروں کی طرح فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دو، نہ جاہل عوام کی طرح انبیاء واولیاء کو صفتِ علم وقدرت میں اللہ تعالیٰ کے برابر ٹھہراؤ،

شرک کی تعریف اور اس کی قسمیں

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ لفظ شَيْـًٔا کے معنی یہاں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ شرک کی کسی قسم جلی یا خفی میں مبتلا نہ ہو، شرک جلی کو تو سب جانتے ہیں کہ کسی غیر اللہ کو عبادت اور اطاعت میں یا اس کی مخصوص صفات میں اللہ تعالیٰ کے برابر یا اس کا ساجھی قرار دینا ہے، اور شرکِ خفی یہ ہے کہ اپنے کاروبار اور... دینی دنیوی مقاصد میں اور نفع نقصان میں اگرچہ عقیدہ تو یہی ہو کہ کارساز اللہ تعالیٰ ہے، مگر عملاً دوسروں کو کارساز سمجھے اور ساری کوششیں دوسروں ہی سے وابستہ رکھے، یا عبادات میں ریاکاری کرے کہ دوسروں کو دکھانے کے لئے نماز وغیرہ کو درست کر کے پڑھے، یا صدقہ خیرات نام آوری کے خیال سے کرے، یا عملاً نفع نقصان کا مالک کسی غیر اللہ کو قرار دے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے ؎

دریں نوعے از شرک پوشیدہ است ؛ کہ زیدم بہ بخشید وعمرم بخست

یعنی اس میں بھی ایک قسم کا شرک چھپا ہوا ہے کہ آدمی یوں سمجھے کہ مجھے زید نے کچھ بخش دیا اور عمر نے نقصان پہنچا دیا، بلکہ حقیقت اس کے سوا نہیں کہ بخشش یا نقصان جو کچھ ہے وہ قادرِ مطلق حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، زید اور عمر پردے ہیں جن کے اندر سے بخشش یا نقصان کا ظہور ہوتا ہے ورنہ جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ اگر ساری دنیا کے جن وانس مل کر تم کو کوئی ایسا نفع پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر نہیں فرمایا تو مجال نہیں کہ پہنچا سکیں، اسی طرح اگر ساری دنیا کے جن وانس مل کر تم کو کوئی ایسا نقصان پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا تو یہ بھی کسی سے ممکن نہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ شرک جلی اور خفی دونوں سے انتہائی پرہیز کرنا چاہئے، اور شرک میں جس طرح بتوں وغیرہ کی پوجا پاٹ داخل ہے، اسی طرح انبیاء واولیاء کو علم وقدرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا بھی شرک میں داخل ہے، اگر خدانخواستہ کسی کا عقیدہ ہی ایسا ہو تو شرک جلی ہے، اور عقیدہ نہ ہو مگر عمل اس طرح کا ہے تو شرک خفی کہلائے گا، اس مقام میں سب سے پہلے شرک سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے، وجہ یہ ہے کہ شرک ایسا جرم ہے جس کے

متعلق قرآن کا فیصلہ ہو کہ اس کی معافی نہیں، اس کے سوا دوسرے گناہوں کی معافی مختلف اسباب سے ہو سکتی ہے، اسی لئے حدیث میں بروایت حضرت عبادہ بن صامتؓ و حضرت ابوالدرداءؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو ساجھی نہ قرار دو، اگرچہ تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں، یا تمہیں سولی پر چڑھا دیا جائے، یا تمہیں زندہ جلا دیا جائے۔

دوسرا گناہ والدین سے بدسلوکی ہے

اس کے بعد دوسری چیز یہ ارشاد فرمائی: وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا، یعنی والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ اور اچھا برتاؤ کرو، مقصد تو اس جگہ یہ ہو کہ والدین کی نافرمانی نہ کرو ان کو ایذاء نہ پہنچاؤ، مگر حکیمانہ انداز سے بیان اس طرح کیا گیا کہ والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو، اس میں اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ والدین کے حق میں صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ ان کی نافرمانی نہ کرو اور ایذاء نہ پہونچاؤ، بلکہ محسن سلوک اور نیازمندانہ برتاؤ کے ذریعہ ان کو راضی رکھنا اور خوش کرنا فرض ہے، جس کا بیان دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ "یعنی ان کے سامنے اپنے بازو نیازمندانہ طور پر پست کرو"۔

اس آیت میں والدین کو ایذاء پہونچانے اور تکلیف دینے کو شرک کے بعد دوسرے نمبر کا جرم قرار دیا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ان کی اطاعت اور راحت رسانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	یعنی آپ کے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ	"یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا، پھر میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے"

[illegible]

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہو کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے افضل اور بہتر عمل کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا نماز کو اس کے وقت (مستحب) میں پڑھنا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا "والدین کے ساتھ اچھا سلوک"۔ پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا عمل ہو؟ فرمایا: "اللہ کے راستہ میں جہاد"۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے تین مرتبہ فرمایا رَغِمَ أَنْفُهُ رَغِمَ أَنْفُهُ رَغِمَ أَنْفُهُ، یعنی ذلیل ہو گیا، ذلیل ہو گیا، ذلیل ہو گیا، صحابۂ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہؐ کون ذلیل ہو گیا؟ فرمایا وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے ایک کو بڑھاپے کے زمانہ میں پایا اور پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا۔

مطلب یہ ہو کہ بڑھاپے کے زمانہ میں والدین کی خدمت سے جنت کا ملنا یقینی ہے بڑا محروم و ذلیل ہے وہ شخص جس نے اتنی سستی جنت کو ہاتھ سے کھو دیا، سستی اس لئے کہ والدین جو اولاد پر طبعی طور سے خود ہی مہربان ہوتے ہیں وہ ذرا سی خدمت سے بہت خوش ہو جاتے ہیں، ان کا خوش رکھنا کسی بڑے عمل کا محتاج نہیں، اور بڑھاپے کی قید اس لئے کہ جس وقت والدین تندرست اور قوی ہیں، اور اپنی ضروریات خود پوری کرتے ہیں، بلکہ اولاد کی بھی مالی اور جانی امداد کر دیتے ہیں اس وقت تو نہ خدمت کے وہ محتاج ہیں نہ اس خدمت کا کوئی خاص وزن ہے، قابل قدر خدمت اس وقت ہی ہو سکتی ہے جبکہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے محتاج ہوں۔

تیسرا حرام قتل اولاد

تیسری چیز جس کا حرام ہونا ان آیات میں بیان ہوا ہے وہ قتل اولاد ہے، اور مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلے ماں باپ کے حق کا بیان تھا جو اولاد کے ذمہ ہے اور اس میں اولاد کے حق کا بیان ہے جو ماں باپ کے ذمہ ہے، اولاد کے ساتھ بدسلوکی کا بدترین معاملہ وہ تھا جو جاہلیت میں ان کو زندہ درگور کرنے یا قتل کرنے کا جاری تھا، اس آیت میں اس سے روکا گیا، ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ، یعنی افلاس کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ہم تم کو بھی رزق دیں گے اور ان کو بھی۔

جاہلیت کے زمانہ میں بے رحمی اور سنگدلی کی یہ بدترین رسم چل پڑی تھی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو اس عار کے خوف سے کہ کسی کو داماد بنانا پڑے گا زندہ کو گڑھے میں دفن کر دیتے تھے، اور بعض اوقات اس خوف سے کہ اولاد کے لئے ضروریاتِ زندگی اور کھانے پینے کا سامان جمع کرنے میں مشکلات پیش آئیں گی، یہ سنگدل لوگ اپنے بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتے تھے، قرآن کریم نے اس رسم کو مٹایا، اور جو ارشاد اوپر مذکور ہوا، اس میں ان کے اس ذہنی مرض کا بھی علاج کر دیا جس کے سبب وہ اس بدترین جرم کے مرتکب ہوتے تھے کہ بچوں کو کھانا کہاں سے کھلائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلا دیا کہ کھانا کھلانے اور رزق پہنچانے کے اصلی ذمہ دار تم نہیں، یہ کام براہِ راست حق تعالیٰ کا ہے، تم خود اپنے رزق اور کھانے میں بھی اسی کے محتاج ہو، وہ دیتا ہے تو تم بچوں کو بھی دیدیتے ہو، وہ اگر تمہیں نہ دے تو تمہاری کیا مجال ہے کہ ایک دانہ گیہوں یا چاول کا خود پیدا کر لو، زمین کے اندر سے بیج کو ایک کونپل کی صورت میں منوں مٹی کو چیر پھاڑ کر نکالنا پھر اس کو درخت کی صورت دینا، پھر اس پر پھول پھل لگانا کس کا کام ہو!

کیا ماں باپ یہ کام کر سکتے ہیں! یہ تو سب قادرِ مطلق کی قدرت و حکمت کے کرشمے ہیں، انسان کے عمل کا اس میں کیا دخل ہے وہ تو صرف اتنا کر سکتا ہے کہ زمین کو نرم کر دے اور درخت نکلے تو پانی دیدے، اور اس کی حفاظت کر لے، مگر پھول پھل پیدا کرنے میں تو اس کا ادنیٰ دخل نہیں، معلوم ہوا کہ ماں باپ کا یہ تصور غلط ہے کہ ہم بچوں کو رزق دیتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کے خزانۂ غیب سے ماں باپ کو بھی ملتا ہے، اولاد کو بھی، اسی لئے اس جگہ ماں باپ کے ذکر کو مقدم کر کے فرمایا کہ ہم تم کو بھی رزق دیں گے اور ان کو بھی، اس تقدیم میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ تم کو رزق اس لئے دیا جاتا ہے کہ تم بچوں کو پہونچاؤ، جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اِنَّمَا تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَائِكُمْ، یعنی تمہارے کمزور لوگوں کے طفیل میں اللہ تعالیٰ تمہاری بھی مدد فرماتے ہیں اور تمہیں رزق دیتے ہیں»

قرآن کریم میں سورۂ اسراء میں بھی یہی مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے، مگر وہاں رزق کے معاملہ میں اولاد کو مقدم ذکر فرمایا نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ، یعنی ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی، وہ اس میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ رزق دینے کے پہلے مستحق ہمارے نزدیک وہ ضعیف بچے ہیں جو خود کچھ نہیں کر سکتے، انہی کی خاطر تمہیں رزق دیا جاتا ہے۔

اولاد کی تعلیمی، اخلاقی تربیت کرنا اور ہدایت کے لئے آزاد چھوڑ دینا بھی ایک طرح قتلِ اولاد ہے

قتلِ اولاد کا جرم اور سخت گناہ ہونا جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے وہ ظاہری قتل کرنے اور مار ڈالنے کے لئے تو ظاہر ہی ہے، اور غور کیا جائے تو اولاد کو تعلیم و تربیت نہ دینا جس کے نتیجہ میں خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت کی فکر سے غافل رہے، بداخلاقیوں اور بے حیائیوں میں گرفتار ہو یہ بھی قتلِ اولاد سے کم نہیں، قرآن کریم نے اس شخص کو مردہ قرار دیا ہے جو اللہ کو نہ پہچانے، اور اس کی اطاعت نہ کرے، آیت اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ میں اسی کا بیان ہے، جو لوگ اپنی اولاد کے اعمال و اخلاق کے درست کرنے پر توجہ نہیں دیتے ان کو آزاد چھوڑتے ہیں یا ایسی غلط تعلیم دلاتے ہیں جس کے نتیجہ میں اسلامی اخلاق تباہ ہوں وہ بھی ایک حیثیت سے قتلِ اولاد کے مجرم ہیں، اور ظاہری قتل کا اثر تو صرف دنیا کی چند روزہ زندگی کو تباہ کرتا ہے، یہ قتل انسان کی اخروی اور دائمی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔

چوتھا حرام بے حیائی کا کام ہر چوتھی چیز جس کے حرام ہونے کا ان آیات میں بیان ہو وہ بے حیائی کے کام ہیں، اس کے متعلق ارشاد فرمایا وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، یعنی بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں اُن کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ۔

فَوَاحِشُ، فاحشہ کی جمع ہے، اور لفظ فحش، فحشاء، اور فاحشہ سب مصدر ہیں جن کا اردو

میں ترجمہ بے حیائی سے کیا جاتا ہے، اور قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ہر ایسے بُرے کام کے لئے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں جس کی بُرائی اور فساد کے اثرات بُرے ہوں اور دور تک پہونچیں، امام راغبؒ نے... مفردات القرآن میں اور ابن اثیرؒ نے نہایہ میں یہی معنی بیان فرمائے ہیں، قرآن کریم میں جا بجا فحش اور فحشاء کی ممانعت وارد ہوئی ہے ایک آیت میں ارشاد ہے يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ، ایک جگہ ارشاد ہے حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ وغیرہ۔

فحش اور فحشاء کے اس مفہوم عام میں تمام بڑے گناہ داخل ہیں خواہ اقوال سے متعلق ہوں یا افعال سے اور ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن اور قلب سے، بدکاری اور بے حیائی کے جتنے کام ہیں وہ بھی سب اس میں داخل ہیں، اسی لئے عام زبانوں پر یہ لفظ بدکاری کے معنی میں بولا جاتا ہے، قرآن کی اس آیت میں فواحش کے قریب جانے سے بھی روکا گیا ہے، اس کو اگر مفہوم عام میں لیا جائے تو تمام بُری خصلتیں اور گناہ خواہ زبان کے ہوں خواہ ہاتھ پاؤں وغیرہ کے، اور خواہ دل سے متعلق ہوں، سبھی اس میں داخل ہو گئے، اور اگر مشہور عوام معنی بے حیائی کے لئے جاویں تو اس کے معنی بدکاری اور اس کے مقدمات اور اسباب مراد ہوں گے۔

پھر اسی آیت میں فواحش کی تفسیر میں یہ بھی فرمادیا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، پہلی تفسیر کے مطابق ظاہری فواحش سے زبان اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کے تمام گناہ مراد ہوں گے، اور باطنی فواحش سے مراد وہ گناہ ہوں گے جو دل سے متعلق ہیں، جیسے حسد، کینہ، حرص، ناشکری، بے صبری وغیرہ

اور دوسری تفسیر کے مطابق ظاہری فواحش سے مراد وہ بے حیائی کے کام ہوں گے جن کو علانیہ کیا جاتا ہے، اور باطنی وہ جو چھپا کر کئے جاویں، کھلی بدکاری میں اس کے مقدمات و لوازمات سب داخل ہیں، بدنیتی سے کسی عورت کی طرف دیکھنا، ہاتھ وغیرہ سے چھونا، اس سے اس طرح کی باتیں کرنا سب اس میں داخل ہیں، اور باطنی بے حیائی میں وہ خیالات اور ارادے اور ان کو پورا کرنے کی خفیہ تدبیریں داخل ہیں جو کسی بے حیائی اور بدکاری کے سلسلہ میں عمل میں لائی جائیں۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ظاہری فواحش سے وہ بے حیائی کے کام مراد ہیں جن کا بُرا ہونا عام طور پر مشہور و معلوم ہے اور سب جانتے ہیں، اور باطنی فواحش سے مراد وہ افعال ہیں جو اللہ کے نزدیک بے حیائی کے کام ہیں، اگرچہ عام طور پر اُن کو لوگ بُرا نہیں جانتے یا عام لوگوں کو ان کا حرام ہونا معلوم نہیں، مثلاً بیوی کو تین طلاق دینے کے بعد بیوی بنا کر رکھ چھوڑنا یا کسی ایسی عورت سے نکاح کر لیا جو شرعاً اس کے لئے حلال نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت فواحش کے اصل مفہوم کے اعتبار سے تمام ظاہری اور

باطنی گناہوں کو اور مشہور عام مفہوم کے اعتبار سے بدکاری و بے حیائی کے جتنے طریقے کھلے یا چھپے ہوئے ہیں ان سب کو شامل ہے، اور حکم اس میں یہ دیا گیا ہے کہ ان چیزوں کے پاس بھی نہ جاؤ، پاس نہ جانے سے مراد یہ ہے کہ ایسی مجلسوں اور ایسے مقامات سے بھی بچو جہاں جا کر اس کا خطرہ ہو کہ ہم گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ایسے کاموں سے بھی بچو جن سے ان گناہوں کا راستہ نکلتا ہو، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ حَامَ حَوْلَ الْحِمٰى اَوْشَكَ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِ، — یعنی جو شخص کسی ممنوع جگہ کے گرد گھومتا ہو تو کچھ بعید نہیں کہ وہ اس میں داخل بھی ہو جائے۔

اس لئے احتیاط کا مقتضیٰ یہی ہے کہ جس جگہ کا داخلہ ممنوع ہے اس جگہ کے ارد گرد بھی نہ پھرے۔

پانچواں حرام قتل ناحق ہے | محرمات میں سے پانچویں چیز قتل ناحق ہے، اس کے متعلق ارشاد فرمایا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ، یعنی جس شخص کا خون اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق پر، اور اس حق کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمائی ہے جو بروایت عبداللہ بن مسعودؓ بخاری و مسلم نے نقل کی ہے وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، مگر تین چیزوں سے، ایک یہ کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو جائے، دوسرے یہ کہ اس نے کسی کو ناحق قتل کر دیا ہو، اس کے قصاص میں مارا جائے، تیسرے یہ کہ اپنا دین حق چھوڑ کر مرتد ہو گیا ہو۔

حضرت عثمان غنیؓ جس وقت باغیوں کے نرغہ میں محصور تھے، اور لوگ ان کو قتل کرنا چاہتے تھے اس وقت بھی حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو یہ حدیث سنا کر کہا کہ بحمداللہ میں ان تینوں چیزوں سے ... بری ہوں، میں نے زمانہ اسلام میں تو کیا زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی بدکاری نہیں کی، اور نہ میں نے کسی کو قتل کیا، اور نہ کبھی میرے دل میں یہ وسوسہ آیا کہ میں اپنے دین اسلام کو چھوڑ دوں، پھر تم مجھے کس بناء پر قتل کرتے ہو!

اور بے وجہ قتل کرنا جیسے مسلمان کا حرام ہے اسی طرح اس غیر مسلم کا قتل بھی ایسا ہی حرام ہے جو کسی اسلامی ملک میں ملک کے قانون کا پابند ہو کر رہتا ہے، یا جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں بروایت ابوبکرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جو کسی ذمی غیر مسلم کو قتل کر دے اس نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ دیا، اور جو شخص اللہ کے عہد کو توڑ دے وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت تک پہونچتی ہے۔

اس ایک آیت میں دس میں سے پانچ حرام و ناجائز چیزوں کا بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ، یعنی ان چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے

تاکہ تم سمجھو۔

چھٹا حرام، یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانا | دوسری آیت میں چھٹا حکم یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانے کی حرمت کے متعلق ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ۔ یعنی یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو مستحسن ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے۔ اس میں یتیم نابالغ بچوں کے ولی اور پالنے والے کو خطاب ہے، کہ وہ ان کے مال کو ایک آگ سمجھیں اور ناجائز طور پر اس کے کھانے اور لینے کے پاس بھی نہ جائیں، جیسا کہ دوسری ایک آیت میں انہی الفاظ کے ساتھ آیا ہے، کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر ظلماً کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔

البتہ یتیم کے مال کی حفاظت کرنا اور کسی ایسی جائز تجارت یا کاروبار میں لگا کر بڑھانا جس میں نقصان کا خطرہ عادۃً نہ ہو، یہ طریقہ مستحسن اور ضروری ہے، یتیموں کے ولی کو ایسا کرنا چاہئے۔

اس کے بعد مال یتیم کی حفاظت کی ذمہ داری کی حد بتلادی حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ، یعنی یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہونچ جائے تو ولی کی ذمہ داری ختم ہو گئی، اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے۔

لفظ اشد کے اصلی معنی قوت کے ہیں، اور اس کی ابتداء جمہور علماء کے نزدیک بالغ ہو جانے سے ہو جاتی ہے، جس وقت بچہ میں آثار بلوغ پائے جائیں یا اس کی عمر پندرہ سال کی پوری ہو جائے، اس وقت اس کو شرعاً بالغ قرار دیا جائے گا۔

البتہ بالغ ہو جانے کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں اپنے مال کی حفاظت اور صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے یا نہیں، اگر صلاحیت دیکھی جائے تو بالغ ہوتے ہی اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے، اور اگر یہ صلاحیت ابھی اس میں موجود نہیں تو پچیس سال کی عمر تک مال کی حفاظت ولی کے ذمہ ہے، اس درمیان میں جس وقت بھی اس کو مال کی حفاظت اور کاروبار کی لیاقت پیدا ہو جائے تو مال اس کو دیا جا سکتا ہے، اور اگر پچیس سال تک بھی اس میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہو تو پھر امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کا مال بہرحال اس کو دیدیا جائے، بشرطیکہ اس کی یہ عدم صلاحیت دیوانگی اور جنون کی حد تک نہ پہونچی ہو، اور بعض ائمہ کے نزدیک اس وقت بھی مال اس کو سپرد نہ کیا جائے، بلکہ قاضی شرعی اس کے مال کی حفاظت کسی ذمہ دار آدمی کے سپرد کر دے۔

یہ مضمون قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے ماخوذ ہے، جس میں فرمایا ہے: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ، یعنی یتیم بچوں میں بالغ ہونے کے بعد اگر تم یہ صلاحیت دیکھو کہ وہ اپنے مال کی خود حفاظت کر سکتے ہیں اور کسی کاروبار میں لگا سکتے ہیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دو، اس آیت نے بتلایا کہ صرف بالغ ہونا مال سپرد کرنے کے لئے کافی

نہیں، بلکہ مال کی حفاظت اور کاروبار کی قابلیت شرط ہے۔

ساتواں حرام ناپ تول میں کمی

ساتواں حکم اس آیت میں ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرنے کا ہے۔ انصاف کا مطلب یہ ہے کہ دینے والا دوسرے فریق کے حق میں کوئی کمی نہ کرے اور لینے والا اپنے حق سے زیادہ نہ لے (روح المعانی)

چیزوں کے لین دین میں ناپ تول میں کمی زیادتی کو قرآن نے شدید حرام قرار دیا ہے، اور اس کے خلاف کرنے والوں کے لئے سورۂ مطففین میں سخت وعید آئی ہے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو تجارت میں ناپ تول کا کام کرتے ہیں خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ناپ اور تول یہ وہ کام ہیں جن میں بے انصافی کرنے کی وجہ سے تم سے پہلے کئی امتیں عذاب الٰہی کے ذریعے تباہ ہو چکی ہیں (تم اس میں پوری احتیاط سے کام لو) (تفسیر ابن کثیر)

افسروں، ملازموں، مزدوروں کا اپنی مقررہ ڈیوٹی اور خدمت میں کوتاہی کرنا بھی ناپ تول میں کمی کرنے کے حکم میں ہے

یاد رہے کہ ناپ تول کی کمی جسکو قرآن میں تطفیف کہا گیا ہے صرف ڈنڈی مارنے اور کم ناپنے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ کسی کے ذمہ دوسرے کا جو حق ہے اس میں کمی کرنا بھی تطفیف میں داخل ہے جیسا کہ موطا امام مالکؒ میں حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص کو نماز کے ارکان میں کمی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ تو نے تطفیف کر دی یعنی جو حق واجب تھا، ادا نہیں کیا، اس کو نقل کر کے امام مالکؒ فرماتے ہیں بِكُلِّ شَيْءٍ وَفَاءٌ وَتَطْفِيفٌ، یعنی حق کا پورا دینا اور کمی کرنا ہر چیز میں ہوتا ہے، صرف ناپ تول میں ہی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو ملازم اپنی ڈیوٹی پوری نہیں کرتا، وقت چراتا ہے، یا کام میں کوتاہی کرتا ہے، وہ کوئی وزیر و امیر ہو یا معمولی ملازم، اور وہ کوئی دفتری کام کرنے والا ہو یا علمی اور دینی خدمت، جو حق اس کے ذمہ ہے اس میں کوتاہی کرے تو وہ بھی مطففین میں داخل ہے، اسی طرح مزدور جو اپنی مقررہ خدمت میں کوتاہی کرے وہ بھی اس میں داخل ہے۔

اس کے بعد فرمایا لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا، یعنی ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتے۔ بعض روایاتِ حدیث میں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے حدِ اختیار تک ناپ تول کا پورا پورا حق ادا کرے تو اگر اس کے باوجود غیر اختیاری طور پر کوئی معمولی کمی بیشی ہو جائے تو وہ معاف ہے، کیونکہ وہ اس کی قدرت و اختیار سے خارج ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس جملہ کا اضافہ کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ ادائے حق کے وقت احتیاط اس میں ہے کہ کچھ زیادہ دیدیا جائے، تاکہ کمی کا شبہ نہ رہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک ایسے ہی موقع پر وزن کرنے والے کو حکم دیا کہ زِنْ وَأَرْجِحْ، یعنی تولو اور جھکتا ہوا تولو۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، بروایت سوید بن قیسؓ)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت یہی تھی کہ جس کسی کا کوئی حق آپ کے ذمہ ہوتا، تو اس کے ادا کرنے کے وقت..... اس کے حق سے زائد ادا فرمانے کو پسند فرماتے تھے، اور بخاری کی ایک حدیث میں بروایت جابر رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ،

> اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت کرے جو بیچنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ دے اور خریدنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ نہ لے، بلکہ کچھ معمولی کمی بھی ہو تو راضی ہو جائے۔

مگر یہ حکم اخلاقی ہے کہ دینے میں زیادہ دے اور لینے میں کم بھی ہو تو جھگڑا نہ کرے، قانونی چیز نہیں کہ آدمی ایسا کرنے پر مجبور ہو، اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن میں یہ ارشاد فرمایا کہ ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ چیز کا حکم نہیں دیتے، یعنی دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ ادا کرنا اور اپنے حق میں کمی پر راضی ہو جانا کوئی جبری حکم نہیں، کیونکہ عام لوگوں کو ایسا کرنا آسان نہیں

آٹھواں حکم عدل و انصاف ہر اس کے خلاف کرنا حرام ہے

ارشاد فرمایا وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ، یعنی جب تم بات کہو تو حق کی کہو، اگرچہ وہ اپنا رشتہ دار ہی ہو۔ اس جگہ کسی خاص بات کا ذکر نہیں، اسی لئے جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہر قسم کی بات کو شامل ہے، خواہ وہ بات کسی معاملہ کی گواہی ہو یا حاکم کی طرف سے فیصلہ یا آپس میں مختلف قسم کی گفتگو ان سب میں ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ ہر جگہ ہر حال بات کرتے ہوئے حق و انصاف کا خیال رہنا چاہئے، کسی مقدمہ کی گواہی یا فیصلہ میں حق و انصاف قائم رکھنے کے معنی ظاہر ہیں، کہ گواہ کو جو بات یقینی طور پر معلوم ہو وہ اپنی طرف سے کسی لفظ کی کمی بیشی کئے بغیر جتنا معلوم ہے صاف صاف کہہ دے، اپنی اٹکل اور گمان کو دخل نہ دے، اور اس کی فکر نہ کرے کہ اس سے کس کو فائدہ پہونچے گا، اور کس کو نقصان، اسی طرح کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنا ہے تو گواہوں کو شرعی اصول پر جانچنے کے بعد جو کچھ ان کی شہادت سے نیز دوسری قسم کے قرائن سے ثابت ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، گواہی اور فیصلہ دونوں میں نہ کسی کی دوستی اور رعایت حق بات کہنے سے مانع ہو، اور نہ کسی کی دشمنی اور مخالفت، اسی لئے اس جگہ یہ جملہ بڑھایا گیا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ، یعنی اگرچہ وہ آدمی جس کے مقدمہ کی شہادت دینا یا فیصلہ کرنا ہے وہ تمہارا رشتہ دار ہی ہو تب بھی حق و انصاف کو نہ گواہی میں ہاتھ سے جانے دو اور نہ فیصلہ میں۔

مقصود اس آیت میں جھوٹی گواہی اور حق کے خلاف فیصلہ سے روکنا ہے، جھوٹی گواہی کے

متعلق ابوداؤد اور ابن ماجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:

"جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے، تین مرتبہ فرمایا، اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ یعنی بت پرستی کے گندہ عقیدہ سے بچو اور جھوٹ بولنے سے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتے ہوئے"

اسی طرح حق کے خلاف فیصلہ کرنے کے بارے میں ابوداؤد نے بروایت حضرت بریدہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

"قاضی (یعنی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے) تین قسم کے ہیں، ان میں سے ایک جنت میں جائے گا، اور دو جہنم میں جس نے معاملہ کی تحقیق شریعت کے موافق کر کے حق کو پہچانا پھر حق کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے اور جس نے تحقیق کر کے حق بات کو جان تو لیا، مگر جان بوجھ کر فیصلہ اس کے خلاف کیا وہ دوزخی ہے، اور اسی طرح وہ قاضی جسکو علم نہ ہو یا تحقیق اور غور فکر میں کمی کی اور جہالت سے کوئی فیصلہ دیدیا وہ بھی جہنم میں جائے گا"

قرآن مجید کی دوسری آیات میں اسی مضمون کو اور بھی زیادہ وضاحت اور تاکید سے بیان فرمایا گیا ہے کہ شہادت یا فیصلہ میں کسی کی دوستی، قرابت اور تعلق کا یا دشمنی اور مخالفت کا کوئی اثر نہ ہونا چاہئے، جیسے ایک جگہ ارشاد ہے: وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ "یعنی حق بات اگرچہ خود تمہارے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف ہو اس کے کہنے میں رکاوٹ نہ ہونی چاہئے"

اسی طرح ایک دوسری آیت میں حکم ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا "یعنی کسی قوم کی دشمنی تمہیں انصاف کے خلاف گواہی دینے یا فیصلہ کرنے پر آمادہ نہ کردے اور گواہی اور فیصلہ کے علاوہ آپس کی گفتگوؤں میں حق و انصاف قائم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جھوٹ نہ بولے، کسی کی غیبت نہ کرے، ایسی بات نہ بولے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے یا کسی کو جانی یا مالی نقصان پہنچے۔

نواں حکم اللہ کے عہد کو پورا کرنا، یعنی عہد شکنی کا حرام ہونا

نواں حکم اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنے اور عہد شکنی سے بچنے کا ہے، ارشاد فرمایا، وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا "یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو" اللہ کے عہد سے مراد وہ عہد بھی ہو سکتا ہے جو ازل میں ہر انسان سے لیا گیا جس میں سب انسانوں سے کہا گیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں"

سب نے جواب دیا بَلٰى "یعنی، بلاشبہ آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں" اس عہد کا مقتضیٰ یہی ہے کہ پروردگار کے کسی حکم کی سرتابی نہ کریں، جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کو سارے کاموں سے مقدم اور اہم جانیں، اور جن کاموں سے منع فرمایا ہے اُن کے پاس بھی نہ جائیں، اور ان کے شبہات سے بھی بچتے رہیں، خلاصہ اس عہد کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کریں۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خاص خاص عہد جن کا ذکر قرآن کے مختلف مواقع میں فرمایا گیا ہے مراد ہوں، اور انہی میں سے یہ تین آیتیں بھی ہیں جن کی تفسیر آپ دیکھ رہے ہیں (جن میں دس احکام تاکید کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں)۔

علماء نے فرمایا کہ اس عہد میں نذر اور منت کا پورا کرنا بھی داخل ہے جو ایک انسان اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے کہ فلاں کام کروں گا یا نہیں کروں گا، (قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں اس کو صراحۃً بھی ذکر فرمایا ہے يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ "یعنی اللہ کے نیک بندے اپنی منتوں کو پورا کیا کرتے ہیں")

(خلاصہ یہ ہے کہ یہ نواں حکم شمار میں تو نواں حکم ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے تمام احکام شرعیہ واجبات اور ممنوعات سب پر حاوی ہے)۔

اس دوسری آیت کے آخر میں فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ "یعنی ان کاموں کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو"

تیسری آیت میں دسواں حکم مذکور ہے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ "یعنی یہ دین محمدی میرا سیدھا راستہ ہے، سو اس راہ پر چلو، اور دوسری راہوں پر مت چلو، کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی"

اس میں لفظ ہٰذَا کا اشارہ دین اسلام یا قرآن کی طرف ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سورۂ انعام کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ اس میں بھی پورے اصول اسلام، توحید، رسالت اور اصول احکام شرعیہ مذکور ہیں (اور مستقیم، دین کے اس راستہ کی صفت ہے جس کو نحوی ترکیب میں بصورت حال ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ دین اسلام کے لئے مستقیم ہونا لازمی وصف ہے اس کے بعد فرمایا فَاتَّبِعُوْهُ یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ دین اسلام میرا راستہ ہے اور وہی مستقیم اور سیدھا راستہ ہے تو اب منزل مقصود کا سیدھا راستہ ہاتھ آ گیا، اس لئے صرف اسی رستہ پر چلو)۔

پھر فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ، سُبُل، سبیل کی جمع ہے، اس کے معنی بھی رستہ کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کی رضاء حاصل کرنے کا اصلی راستہ تو ایک ہی ہے، لیکن دنیا میں لوگوں نے اپنے اپنے خیالات سے مختلف راستے بنا رکھے ہیں، تم ان

راستوں میں سے کسی راستہ پر نہ چلو کیونکہ یہ راستے حقیقت میں خدا تعالیٰ تک پہونچنے کے نہیں ہیں، اس لئے جو ان راستوں پر چلے گا وہ اللہ کے راستہ سے دُور جا پڑے گا۔

تفسیر مظہری میں فرمایا ہے کہ قرآن کریم نازل کرنے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے کا منشا، تو یہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات اور اپنے ارادوں اور تجویزوں کو قرآن و سنت کے تابع کریں، اور اپنی زندگیوں کو ان کے سانچہ میں ڈھالیں، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ لوگوں نے قرآن و سنت کو اپنے خیالات اور تجویزات کے سانچہ میں ڈھالنے کی ٹھان لی، جو آیت یا حدیث اپنے منشاء کے خلاف نظر آئی اس کو تاویلیں کر کے اپنی خواہش کے مطابق بنالی، یہیں سے دوسری گمراہ کن راہیں پیدا ہوتی ہیں، جو بدعات اور شبہات کی راہیں ہیں، انھی سے بچنے کے لئے اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے۔

مسند دارمی میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ اللہ کا رستہ ہے، پھر اس کے دائیں بائیں اور خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ سُبل ہیں، (یعنی وہ راستے جن پر چلنے سے اس آیت میں منع فرمایا ہے) اور فرمایا کہ ان میں سے ہر راستہ پر ایک شیطان مسلط ہے، جو لوگوں کو سیدھے راستہ سے ہٹا کر اس طرف بلاتا ہے اور اس کے بعد آپؐ نے استدلال کے طور پر اس آیت کو تلاوت فرمایا۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔

تینوں آیتوں کی تفسیر اور ان میں بیان کئے ہوئے دس اصول محرمات کا بیان پورا ہوگیا، آخر میں قرآن کریم کے اس اسلوب بیان پر بھی ایک نظر ڈالئے، کہ اس جگہ دس احکام بیان کئے تھے، ان کو آجکل کی کتب قانون کی طرح دس دفعات میں نہیں لکھ دیا، بلکہ پہلے پانچ حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ، اور پھر اور چار حکم بیان فرمانے کے بعد پھر اسی جملہ کو دوبارہ اس فرق کے ساتھ ذکر کیا کہ تَعْقِلُوْنَ کے بجائے تَذَكَّرُوْنَ فرمایا اور پھر آخری حکم ایک مستقل آیت میں بیان فرما کر پھر اسی جملہ کا اعادہ اس فرق کے ساتھ کیا کہ تَذَكَّرُوْنَ کے بجائے تَتَّقُوْنَ فرمایا۔

قرآن کریم کے اس حکیمانہ اسلوب بیان میں بہت سی حکمتیں ہیں۔

اوّل یہ کہ قرآن کریم عام دنیا کے قوانین کی طرح محض حاکمانہ قانون نہیں، بلکہ مربیانہ قانون ہے، اسی لئے ہر قانون کے ساتھ اس کو آسان کرنے کی تدبیر بھی بتلائی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور فکر آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو قانون کی پابندی پر خلوت و جلوت

میں مجبور کرنے والی ہے، اسی لئے تینوں آیتوں کے آخر میں ایسے کلمات لائے گئے جن سے انسان کا رُخ مادی دنیا سے پھر کر اللہ تعالیٰ اور آخرت کی طرف ہو جائے۔

پہلی آیت میں جو پانچ احکام بیان کئے گئے ہیں شرکؔ سے بچنا، والدینؔ کی نافرمانی سے بچنا، قتلؔ اولاد سے بچنا، بے حیائی کے کاموں سے بچنا، کسی شخص کا ناحق خون کرنے سے بچنا، ان کے آخر میں تو لفظ تَعْقِلُوْنَ استعمال فرمایا، کیونکہ زمانۂ جاہلیت والے ان چیزوں کو کوئی عیب ہی نہ جانتے تھے، اس لئے اشارہ کیا گیا کہ آبائی رسموں اور خیالوں کو چھوڑ کر عقل سے کام لو۔

دوسری آیت میں چار احکام بیان ہوئے، یعنی مالِ یتیم کو ناحق نہ کھانا، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، بات کہنے میں حق اور صدق کا لحاظ رکھنا اور اللہ کے عہد کو پورا کرنا۔

یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ضروری ہونے کو تو یہ جاہل بھی جانتے تھے، اور ان میں کچھ لوگ عمل بھی کرتے تھے، مگر اکثر ان میں غفلت برتی جاتی تھی، اور غفلت کا علاج ہے تذکرہ، یعنی خدا و آخرت کی یاد، اس لئے اس آیت کے آخر میں لفظ تَذَكَّرُوْنَ فرمایا۔

تیسری آیت میں صراط مستقیم کو اختیار کرنے اور اس کے خلاف دوسری راہوں سے بچنے کی ہدایت ہے، اور صرف خوف خدا ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو اپنے خیالات و خواہشات سے باز رکھنے کا صحیح ذریعہ ہو سکتی ہے، اس لئے اس کے آخر میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ارشاد فرمایا۔

اور تینوں جگہ لفظ وصیت کا لایا گیا، جو تاکیدی حکم کو کہا جاتا ہے، اسی لئے بعض صحابہ کرام نے فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہر کیا ہوا وصیت نامہ دیکھنا چاہے وہ یہ تین آیتیں پڑھ لے۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا

پھر دی ہم نے موسیٰ کو کتاب واسطے پورا کرنے نعمت کے نیک کام والوں پر اور واسطے

19 ع ۶ لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

تفصیل ہر شے کے اور ہدایت اور رحمت کے لئے تاکہ وہ لوگ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں،

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ

اور ایک یہ کتاب ہے کہ ہم نے اتاری برکت والی سو اس پر چلو اور ڈرتے رہو تاکہ تم پر

تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰي طَاۗىِٕفَتَيْنِ

رحمت ہو اس واسطے کہ کبھی تم کہنے لگو کہ کتاب جو اتری تھی سو انہی دو فرقوں پر

مِن قَبۡلِنَا وَإِن كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمۡ لَغَٰفِلِينَ ﴿١٥٦﴾ أَوۡ تَقُولُوا

جو ہم سے پہلے تھے اور ہم کو تو ان کے پڑھنے پڑھانے کی خبر ہی نہ تھی، یا کہنے لگو کہ

لَوۡ أَنَّآ أُنزِلَ عَلَيۡنَا ٱلۡكِتَٰبُ لَكُنَّآ أَهۡدَىٰ مِنۡهُمۡۚ فَقَدۡ جَآءَكُم

اگر ہم پر اُترتی کتاب تو ہم تو راہ پر چلتے ان سے بہتر، سو آچکی تمہارے پاس

بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمۡ وَهُدًى وَرَحۡمَةٌۚ فَمَنۡ أَظۡلَمُ مِمَّن

حجت تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت اب اس سے زیادہ ظالم کون جو

كَذَّبَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَصَدَفَ عَنۡهَاۗ سَنَجۡزِي ٱلَّذِينَ

جھٹلاوے اللہ کی آیتوں کو اور ان سے کترا دے ہم سزا دیں گے ان کو جو ہماری

يَصۡدِفُونَ عَنۡ ءَايَٰتِنَا سُوٓءَ ٱلۡعَذَابِ بِمَا كَانُوا يَصۡدِفُونَ ﴿١٥٧﴾

آیتوں سے کتراتے ہیں برا عذاب بدلے میں اس کترانے کے

خلاصۂ تفسیر

پھر (مضمون ابطالِ شرک کے بعد ہم مسئلۂ نبوت میں کلام کرتے ہیں کہ ہم نے صرف آپ کو اکیلا نبی نہیں بنایا جس پر یہ لوگ اس قدر شور و غل مچا رہے ہیں، بلکہ آپ کے قبل) ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) کتاب (توراۃ) دی تھی (جس سے) اچھی طرح عمل کرنے والوں پر (ہماری) نعمت پوری ہو (کہ عمل کر کے ثواب کامل حاصل کریں) اور سب (ضروری) احکام کی (اس کے ذریعہ سے) تفصیل ہو جائے اور (اس کے ذریعہ سے سب کو) رہنمائی ہو اور (ماننے والوں کیلئے) رحمت ہو (ہم نے اس صفت کی کتاب اس لئے دی) تاکہ وہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل) اپنے رب کے ملنے پر یقین لاویں (اور اعتقادِ لقاء سے سب احکام کو بجا لاویں) اور (جب اس کا اور اس کے تتمہ انجیل کا دورہ ختم ہو چکا اس کے بعد) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے (آپ کے پاس) بھیجا بڑی خیر و برکت والی سو (اب) اس کا اتباع کرو، اور (اس سے خلاف کرنے کے باب میں خدا سے) ڈرو تاکہ تم پر (اللہ تعالیٰ کی) رحمت ہو اور ہم نے یہ قرآن اس لئے بھی نازل کیا کہ (کبھی تم لوگ (قیامت میں در صورت اس کے نازل نہ ہونے کے کفر و شرک پر عذاب کے وقت) یوں کہنے لگتے کہ کتاب (آسمانی) تو صرف ہم سے پہلے جو دو فرقے (یہودی عیسائی) تھے ان پر نازل ہوئی تھی اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے (اس لئے ہم کو توحید کی تحقیق نہ ہوئی) یا (اور مؤمنین سابقین کو ثواب ملنے کے وقت) یوں کہنے لگتے کہ اگر ہم پر کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان (مؤمنین سابقین) سے بھی زیادہ راہ پر ہوتے (اور عقائد و اعمال میں ان سے زیادہ —— —— —— ——

کمال حاصل کر کے ثواب کے مستحق ہوتے) سو (یاد رکھو کہ) اب (تمہارے پاس کوئی عذر نہیں، تمہارے پاس (بھی) تمہارے رب کے پاس سے ایک کتاب (جس کے احکام) واضح (ہیں) اور (جو) رہنمائی کا ذریعہ (ہے) اور (خدا کی) رحمت (ہے) آچکی ہے سو (ایسی کافی شافی کتاب آنے کے بعد) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو ہماری ان آیتوں کو جھوٹا بتلاوے (اور دوسروں کو بھی) اس سے روکے ہم ابھی (آخرت میں) ان لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں سے روکتے ہیں ان کو اس روکنے کے سبب سخت سزا دیں گے (یہ سختی اس روکنے سے بڑھی ورنہ صرف تکذیب بھی موجب سزا ہے)۔

معارف و مسائل

وجہ غفلت یہ نہیں کہ توراۃ و انجیل لغتِ عرب میں نہ تھی، کیونکہ ترجمہ کے ذریعہ سے مضامین کی اطلاع ممکن ہو بلکہ واقع ہے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب نے اہلِ عرب کی تعلیم و توحید کا کبھی اہتمام نہیں کیا، اور اتفاقاً کان میں کوئی مضمون پڑجانا عادۃً تنبہ میں کم مؤثر ہے، گو اس قدر تنبہ پر طلب اور تامل واجب ہو جاتا ہے، اور اسی بناء پر ترکِ توحید پر عذاب ممکن تھا، اور اس سے عمومِ بعثت موسویہ و عیسویہ کا اشکال لازم نہیں آتا کیونکہ اختصاص اس عموم کا ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باعتبار مجموعۂ اصول و فروع کے ہے، ورنہ اصول میں سب انبیاء کا اتباع سب خلائق پر واجب ہے، پس اس بناء پر عذاب صحیح ہوتا، لیکن یہ عذر بادی النظر میں پیش کیا جاسکتا تھا، اب اس کی بھی گنجائش نہ رہی اور حجۃ اللہ تام ہوگئی۔

اور دوسرا قول لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ کے متعلق ایک سوال و جواب باعتبار ناجین اہلِ فترت کے سورۂ مائدہ کے رکوع سوم کے آخر میں گذر چکا ہے۔

هَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأۡتِيَهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ أَوۡ يَأۡتِيَ رَبُّكَ

کاہے کی راہ دیکھتے ہیں لوگ مگر یہی کہ ان پر آئیں فرشتے یا آئے تیرا رب

أَوۡ يَأۡتِيَ بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَۗ يَوۡمَ يَأۡتِي بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ لَا

یا آئے کوئی نشانی تیرے رب کی، جس دن آئے گی نشانی تیرے رب کی، کام نہ

يَنفَعُ نَفۡسًا إِيمَٰنُهَا لَمۡ تَكُنۡ ءَامَنَتۡ مِن قَبۡلُ أَوۡ كَسَبَتۡ

آئے گا کسی کے اس کا ایمان لانا جو کہ پہلے سے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان

فِيٓ إِيمَٰنِهَا خَيۡرٗاۗ قُلِ ٱنتَظِرُوٓاْ إِنَّا مُنتَظِرُونَ ﴿١٥٨﴾

میں کچھ نیکی نہ کی تھی تو کہہ دے تم راہ دیکھو ہم بھی راہ دیکھتے ہیں

خلاصۂ تفسیر

یہ لوگ (جو کہ بعد نزول کتاب و بینات و وضوح حق کے بھی ایمان نہیں لاتے اپنے ایمان لانے کے لئے) صرف اس امر کے منتظر (معلوم ہوتے) ہیں (یعنی ایسا توقف کر رہے ہیں جیسے کوئی انتظار کر رہا ہو) کہ ان کے پاس فرشتے آویں یا ان کے پاس آپ کا رب آوے (جیسا قیامت میں حساب کے وقت واقع ہوگا) یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی (منجملہ قیامت کی نشانیوں کے) آوے (مراد اس بڑی نشانی سے آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے، مطلب یہ ہوا کہ کیا ایمان لانے میں قیامت کے وقوع یا قرب کا انتظار ہے سو اس کے متعلق سن رکھیں کہ) جس روز آپ کے رب کی (یہ) بڑی نشانی (مذکور) آپہنچے گی (اس روز) کسی ایسے شخص کا ایمان اس کے کام نہ آوے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا ہو (بلکہ اسی روز ایمان لایا ہو) یا (ایمان تو پہلے سے بھی رکھتا ہو لیکن) اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہو (بلکہ اعمالِ بد اور گناہوں میں مبتلا ہو، اور اس روز ان سے توبہ کر کے اعمالِ نیک شروع کرے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی، اور اس سے قبل اگر معاصی سے توبہ کرتا تو مؤمن ہونے کی برکت سے توبہ قبول ہو جاتی، تو قبول توبہ منجملہ منافع ایمان کے ہے، اس وقت ایمان نے یہ خاص نفع نہ دیا اور جب علامت قیامت مانع ہوگئی قبولِ ایمان و توبہ سے تو خاص وقوعِ قیامت تو بدرجۂ اولیٰ مانع ہوگا، پھر انتظار کا ہے کا، اور اگر اس توبیخ پر بھی ایمان نہ لاویں تو) آپ (تہدید مزید کے طور پر) فرما دیجئے کہ (خیر بہتر) تم (ان امور کے) منتظر رہو (اور مسلمان نہیں ہوتے تو مت ہو) ہم بھی (ان امور کے) منتظر ہیں (اس وقت تم پر مصیبت پڑے گی، اور ہم مؤمن انشاء اللہ تعالیٰ ناجی ہوں گے)۔

معارف و مسائل

سورۂ انعام کا اکثر حصہ اہل مکہ اور مشرکین عرب کے عقائد و اعمال کی اصلاح اور ان کے شبہات اور سوالات کے جواب میں نازل ہوا ہے۔

اس تمام سورۃ اور خصوصاً پچھلی آیات میں مکہ اور عرب کے باشندوں پر واضح کر دیا گیا کہ تم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات و بینات دیکھ چکے، پچھلی کتابوں اور پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں آپ کے متعلق سن چکے، پھر ایک اُمّیِ محض کی زبان سے قرآن کی آیات بینات سن چکے جو ایک مستقل معجزہ بن کر آیا، اب حق و صدق کی راہیں تمہارے سامنے کھل چکیں، اور خدا تعالیٰ کی حجت تم پر تمام ہو چکی، اب ایمان لانے میں کس چیز کا انتظار ہے۔

اس مضمون کو اس آیت مذکورہ میں نہایت بلیغ پیرایہ میں اس طرح بیان فرمایا، هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ، یعنی یہ لوگ کیا ایمان لانے میں اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ موت کے فرشتے ان کے پاس پہونچ جائیں، یا میدانِ حشر کا انتظار کر رہے ہیں کہ جس میں جزاء و سزا کے فیصلہ کے لئے اللہ تعالیٰ آئے گا، یا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ قیامت کی بعض آخری نشانیاں دیکھ لیں، رب کریم کا میدانِ قیامت میں فیصلہ کے لئے تشریف فرما ہونا قرآن مجید کی کئی آیتوں میں بیان ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں اسی مضمون کی آیت اس طرح آئی ہے،

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ	یعنی کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کے سایہ میں ان کے پاس آجائے اور فرشتے آجائیں اور لوگوں کے لئے جنت و دوزخ کا جو فیصلہ ہونا ہے وہ ہو جائے"

اللہ تعالیٰ کا میدانِ قیامت میں تشریف فرما ہونا کس شان کس کیفیت کے ساتھ ہوگا اس کا عقلِ انسانی احاطہ نہیں کر سکتی، اس لئے صحابہ کرام اور اسلافِ امت کا مسلک اس قسم کی آیات کے متعلق یہ ہے کہ جو قرآن میں ذکر کیا گیا ہے اس پر ایمان لایا جائے اور یقین کیا جائے اور اس کی کیفیات کو علمِ الٰہی کے حوالہ کیا جائے، مثلاً اس آیت میں یہ یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ میدانِ قیامت میں فیصلہ جزاء و سزا کے لئے تشریف فرما ہوں گے، اور اس میں بحث اور فکر نہ کی جائے کہ کس کیفیت اور کس جہت میں ہوں گے۔

اس آیت میں آگے ارشاد فرمایا، يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيْمَانِهَا خَيْرًا، اس میں متنبہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بعض نشانیاں سامنے آجانے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، جو شخص اس سے پہلے ایمان نہیں لایا اب ایمان لائے گا تو قبول نہیں ہوگا، اور جو شخص ایمان تو لا چکا تھا مگر عمل نیک نہیں کئے تھے وہ اب توبہ کر کے آئندہ نیک عمل کا ارادہ کرے گا تو اس کی بھی توبہ قبول نہ ہوگی، خلاصہ یہ ہے کہ کافر اپنے کفر سے یا فاسق اپنے فسق و معصیت سے اگر اس وقت توبہ کرنا چاہے گا تو وہ توبہ قبول نہ ہوگی۔

سبب یہ ہے کہ ایمان اور توبہ صرف اس وقت تک قبول ہو سکتی ہے جب تک انسان کے اختیار میں ہے، اور جب عذابِ الٰہی کا اور حقائقِ آخرت کا مشاہدہ ہو گیا تو ہر انسان ایمان لانے میں اور گناہ سے باز آنے پر خود بخود مجبور ہو گیا، مجبوری کا ایمان اور توبہ قابلِ قبول نہیں،

قرآن مجید کی بے شمار آیات میں مذکور ہے کہ اہلِ دوزخ دوزخ میں پہونچ کر فریاد کریں گے، اور بڑے بڑے وعدے کریں گے کہ اگر ہمیں اب دنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے تو ہم ایمان اور عملِ صالح کے سوا کچھ نہ کریں گے، مگر سب کا جواب یہی ہوگا کہ ایمان و عمل کا وقت ختم ہو چکا، اور اب جو کچھ کہہ رہے ہو مجبور ہو کر کہہ رہے ہو اس کا اعتبار نہیں۔

اسی آیت کی تفسیر میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جس وقت قیامت کی آخری نشانیوں میں یہ نشانی ظاہر ہوگی کہ آفتاب مشرق کے بجائے مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا، اور اس کو دیکھتے ہی سارے جہان کے کافر ایمان کا کلمہ پڑھنے لگیں گے اور سارے نافرمان فرمان بردار بن جائیں گے، لیکن اس وقت کا ایمان اور توبہ قابلِ قبول نہ ہوگا (بغوی بسندہٖ عن ابی ہریرۃؓ)

اس آیت میں اتنی بات تو قرآنی تصریح سے معلوم ہوگئی کہ بعض نشانیاں ایسی واقع ہوں گی، جن کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، کسی کافر یا فاسق کی توبہ قبول نہ ہوگی، لیکن قرآن کریم نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی، کہ وہ کونسی نشانی ہے۔

صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں بروایت ابوہریرہؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک یہ واقعہ پیش نہ آجائے کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہو، جب لوگ یہ نشانی دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے، یہی وہ وقت ہوگا جس کے لئے قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ اس وقت کسی نفس کو ایمان لانا نفع نہیں دے گا"۔

اسکی تفصیل صحیح مسلم میں بروایت حذیفہ ابن اُسیدؓ اس طرح نقل کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام علاماتِ قیامت کا تذکرہ آپس میں کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، اس وقت آپؐ نے فرمایا کہ قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو، آفتاب[۱] کا جانبِ مغرب سے نکلنا، اور ایک[۲] خاص قسم کا دھواں، اور دابۃ[۳] الارض اور یاجوج[۴] ماجوج کا نکلنا، عیسیٰ[۵] علیہ السلام کا نازل ہونا، دجال[۶] کا نکلنا، اور تین[۷،۸،۹] جگہوں پر زمین کا دھنس جانا، ایک مشرق میں، ایک مغرب میں، ایک جزیرۃ العرب میں، اور ایک[۱۰] آگ جو عدن کے قعر سے نکلے گی اور لوگوں کو آگے آگے ہنکا کر لے چلے گی۔

اور مسند احمد میں بروایت ابن عمروؓ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان آیات میں سب سے پہلے مغرب کی طرف سے طلوعِ آفتاب اور دابۃ الارض کا نکلنا واقع ہوگا۔

امام قرطبیؒ نے تذکرہ میں اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ یہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس واقعہ یعنی مغرب کی طرف سے آفتاب طلوع ہونے کے بعد ایک سو بیس سال تک دنیا قائم رہے گی (روح المعانی)

اس تفصیل کے بعد یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو روایاتِ صحیحہ کے موافق آپ لوگوں کو ایمان کی دعوت دیں گے، اور لوگ ایمان قبول کریں گے، اور پوری دنیا میں نظامِ اسلام رائج ہوگا، ظاہر ہے کہ اگر اس وقت کا ایمان مقبول نہ ہو تو یہ دعوت اور لوگوں کا اسلام میں داخلہ سب غلط ہو جاتا ہے۔

تفسیر روح المعانی میں تو اس کا یہ جواب اختیار کیا ہے کہ مغرب کی طرف سے آفتاب طلوع ہونے کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تشریف لانے کے کافی زمانہ بعد میں ہوگا، اور اسی وقت دروازہ توبہ کا بند ہوگا۔

اور علامہ بلقینیؒ وغیرہ نے فرمایا کہ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ ایمان اور توبہ قبول نہ ہونے کا یہ حکم جو آفتاب کے مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے وقت ہوگا آخر زمانہ تک باقی نہ رہے، بلکہ کچھ عرصہ کے بعد یہ حکم بدل جائے اور ایمان و توبہ قبول ہونے لگے۔ (روح المعانی) واللہ اعلم

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں اگرچہ اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ جس نشانی کے ظاہر ہونے کے بعد توبہ قبول نہ ہوگی وہ کونسی نشانی ہے، مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے واضح ہوگیا کہ اس سے مراد آفتاب کا جانبِ مغرب سے طلوع ہے۔

اور قرآن کریم نے خود کیوں اس کی وضاحت نہ کر دی؟ تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس جگہ قرآن کا ابہام ہی غافل انسان کو چونکانے میں زیادہ مفید ہے کہ اس کو ہر نئے پیش آنے والے واقعہ سے اس پر تنبیہ ہوتی رہے اور توبہ میں جلدی کرے۔

اس کے علاوہ اس ابہام اور اجمال سے ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ اس پر تنبیہ ہو جائے کہ جس طرح پورے عالم کے لئے مغرب سے آفتاب طلوع ہونے پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائیگا اسی طرح اس کا ایک نمونہ ہر انسان کے لئے شخصی طور پر توبہ کے منقطع ہو جانے کا اس کی موت کے وقت پیش آتا ہے۔

قرآن کریم نے ایک دوسری آیت میں اس کو واضح طور پر بھی بیان فرما دیا ہے:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ	"یعنی اُن لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب

الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ — "ان میں سے کسی کی موت آجائے تو کہتا ہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں"۔

اور اسی کی تشریح میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ تَوْبَةَ الْعَبْدِ تُقْبَلُ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ۔ — "یعنی بندہ کی توبہ اُس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک اس کی رُوح حلق میں آکر غرغرہ موت کی صورت پیدا نہ ہوجائے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ نزعِ رُوح کے وقت جب سانس آخری ہو اُس وقت بھی چونکہ فرشتے موت کے سامنے آجاتے ہیں اُس وقت بھی توبہ قبول نہیں ہوتی، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ صورت حال بھی اللہ کی طرف سے ایک اہم نشانی ہے، اس لئے آیتِ مذکورہ میں بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ میں یہ موت کا وقت بھی داخل ہے، جیسا کہ تفسیر بحر محیط میں بعض علماء کا یہ قول نقل بھی کیا ہے، اور بعض بزرگوں نے فرمایا ہے: مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُهٗ۔ یعنی جو شخص مرگیا اس کی قیامت تو اسی وقت قائم ہوگئی، کیونکہ دار العمل ختم ہوا اور جزاءِ اعمال کا کچھ نمونہ قبر ہی سے شروع ہوگیا، صائب نے اسی مضمون کو نظم کیا ہے ؎

بیخبر دیر رسیدی درِ محمل بستند ٭ توبہ را نفس بازپسیں دست زدست

یہاں عربی زبان کے اعتبار سے یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں پہلے فرمایا اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ اور پھر اسی جملہ کا اعادہ کر کے فرمایا یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا، اس میں ضمیر سے کام لے کر کلام کو مختصر نہیں کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کلمہ میں جو بَعْضُ اٰیٰتِ مذکور ہیں وہ اور ہیں، اور دوسرے کلمہ کی بَعْضُ اٰیٰت اس سے مختلف ہیں، اس سے اس تفصیل کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جو ابھی آپ نے بروایت حذیفہ ابن اُسیدؓ پڑھی ہے کہ قیامت کی دس نشانیاں بہت اہم ہیں، ان میں سے آخری نشانی مغرب سے طلوع آفتاب ہے جو انقطاعِ توبہ کی علامت ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ، اس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اللہ کی ساری حجتیں پوری ہوجانے کے بعد بھی اگر تمہیں موت یا قیامت کا انتظار ہے تو یہ انتظار کرتے رہو، ہم بھی اسی کا انتظار کریں گے کہ تمہارے ساتھ تمہارے رب کا کیا معاملہ ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ

جنھوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہو گئے بہت سے فرقے، تجھ کو ان سے کچھ

شَیْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

سروکار نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہی جتلا دیگا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے،

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ

جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے اور جو کوئی لاتا ہے

بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

ایک بُرائی سو سزا پائے گا اسی کے برابر اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصۂ تفسیر

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو (جن کے وہ مکلف ہیں) جدا جدا کر دیا (یعنی دینِ حق کو بتمامہ قبول نہ کیا، خواہ سب کو چھوڑ دیا یا بعض کو اور طریقے شرک و کفر و بدعت کے اختیار کر لئے) اور (مختلف) گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں (یعنی آپ ان سے بری ہیں، آپ پر کوئی الزام نہیں) بس (وہ خود اپنے نیک و بد کے ذمہ دار ہیں، اور) ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے (وہ دیکھ بھال رہے ہیں) پھر (قیامت میں) ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے (اور حجت قائم کر کے استحقاقِ عذاب ظاہر کر دیں گے) جو شخص نیک کام کرے گا اس کو (اقل درجہ) اس کے دس حصے ملیں گے (یعنی ایسا سمجھا جاوے گا کہ گویا وہ نیکی دس بار کی اور نیز ایک نیکی پر جس قدر ثواب ملتا اب دس حصے ویسے ثواب کے ملیں گے) اور جو شخص برا کام کرے گا سو اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی (زیادہ نہ ملے گی) اور ان لوگوں پر (ذرا بھی) ظلم نہ ہوگا (کہ کوئی نیکی درج نہ ہو یا کوئی بدی زیادہ کر کے لکھ لی جاوے)۔

معارف و مسائل

سورۂ انعام کا بیشتر حصہ مشرکین مکہ کے خطاب اور ان کے سوال و جواب کے متعلق آیا ہے، جس میں ان کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ صرف قرآن اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں منحصر ہے، جس طرح آپ سے پہلے انبیاء کے زمانہ میں ان کا اور ان کی کتاب و شریعت کا اتباع مدار نجات تھا، آج صرف آپ کی اور آپ کی شریعت

کی پیروی مدارِ نجات ہے، عقل سے کام لو اور اس سیدھے راستے کو چھوڑ کر دائیں بائیں کے غلط راستوں کو اختیار نہ کرو، ورنہ وہ راستے تمہیں خدا تعالیٰ سے دُور کر دیں گے۔

مذکورہ آیات سے پہلی آیت میں ایک عام خطاب ہے، جس میں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب داخل ہیں، ان سب کو مخاطب کر کے اللہ کے سیدھے راستے سے منحرف ہونے والوں کا انجام بد بیان کیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کا ان غلط راستوں پر چلنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے، پھر اُن میں غلط راستے وہ بھی ہیں جو صراطِ مستقیم سے بالکل مخالف جانب لے جانے والے ہیں، جیسے مشرکین اور اہلِ کتاب کے راستے، اور وہ راستے بھی ہیں جو مخالف جانب میں تو نہیں مگر سیدھے راستے سے ہٹا کر دائیں بائیں لے جانے والے ہیں، وہ شبہات اور بدعات کے راستے ہیں، وہ بھی انسان کو گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔

ارشاد فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ "یعنی وہ لوگ جنھوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہو گئے بہت سے فرقے، تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے، پھر وہ جتلائے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے"

اس آیت میں غلط راستوں پر پڑنے والوں کے متعلق اوّل تو یہ بتلا دیا کہ اللہ کا رسولؐ ان سے بری ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا کوئی تعلق نہیں، پھر ان کو یہ وعید شدید سنائی کہ ان کا معاملہ بس خدا تعالیٰ کے حوالے ہے وہی ان کو قیامت کے روز سزا دیں گے۔

دین میں تفریق ڈالنا اور فرقے بن جانا جو اس آیت میں مذکور ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اصولِ دین کے اتباع کو چھوڑ کر اپنے خیالات اور خواہشات کے مطابق یا شیطانی مکر و تلبیس میں مبتلا ہو کر دین میں کچھ نئی چیزیں بڑھا دے یا بعض چیزوں کو چھوڑ دے۔

دین میں بدعت ایجاد کرنے پر وعید شدید

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس میں پچھلی امتوں کے لوگ بھی داخل ہیں، جنھوں نے اپنے اصولِ دین کو ترک کر کے اپنی طرف سے کچھ چیزیں ملا دی تھیں، اور اس امت کے اہلِ بدعت بھی جو دین میں اپنی طرف سے بے بنیاد چیزوں کو شامل کرتے رہتے ہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس مضمون کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:۔

"میری امت کو بھی وہی حالات پیش آویں گے جو بنی اسرائیل کو پیش آئے جس طرح کی بداعمالیوں میں وہ مبتلا ہوئے میری اُمت کے لوگ بھی مبتلا ہوں گے، بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں بٹ گئے تھے، میری اُمت کے تہتّر فرقے ہو جاویں گے جن میں سے ایک فرقہ کے علاوہ سب دوزخ میں جائیں گے، صحابہ کرام نے

عرض کیا کہ وہ نجات پانے والا فرقہ کونسا ہے، فرمایا مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ، یعنی وہ جماعت جو میرے طریقہ پر اور میرے صحابہ کے طریقہ پر چلے گی وہ نجات پائیگی (اس روایت کو ترمذی، ابوداؤد نے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے)"

اور طبرانی نے بسند معتبر حضرت فاروق اعظمؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس آیت میں جن فرقوں کا ذکر ہے وہ اہلِ بدعت اور اپنی خواہشات و خیالات کے تابع نئے طریقے ایجاد کرنے والے ہیں، یہی مضمون حضرت ابوہریرہؓ سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہے، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں نئے نئے طریقے اپنی طرف سے ایجاد کرنے کو بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

امام احمد، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے بروایت عرباض بن ساریہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت اختلافات دیکھیں گے، اس لئے (میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ) تم میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے اسی کے مطابق ہر کام میں عمل کرو، نئی نئی طریقوں سے بچتے رہو، کیونکہ دین میں نئی پیدا کی ہوئی ہر چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے"

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر جدا ہو گیا اس نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے نکال دیا (رواہ ابوداؤد و احمد)

تفسیر مظہری میں ہے کہ جماعت سے مراد اس حدیث میں جماعتِ صحابہ ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے آقا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا، اور آپ کو قرآن عطا فرمایا، اور قرآن کے علاوہ دوسری وحی عطا فرمائی جس کو حدیث یا سنت کہا جاتا ہے، پھر قرآن میں بہت سی آیات مشکل یا مجمل یا مبہم ہیں، ان کی تفسیر و بیان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ بیان کرنے کا وعدہ فرمایا، ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ کا یہی مطلب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مشکلات اور مبہمات کی تفسیر اور اپنی سنّت کی تفصیلات ... اپنے بلاواسطہ شاگردوں یعنی صحابہ کرام کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سکھلائیں، اس لئے جمہور صحابہ کا عمل پوری شریعتِ آلہیہ کا بیان و تفسیر ہے۔

اس لئے مسلمان کی سعادت اسی میں ہے کہ ہر کام میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے، اور جس آیت یا حدیث کی مراد میں اشتباہ ہو اس میں اس کو

اختیار کرے جس کو جمہور صحابہ کرام نے اختیار فرمایا ہو۔

اسی مقدس اصول کو نظر انداز کر دینے سے اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے کہ تعاملِ صحابہ اور تفسیراتِ صحابہ کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے جو جی میں آیا اس کو قرآن و سنت کا مفہوم قرار دیدیا، یہی وہ گمراہی کے راستے ہیں جن سے قرآن کریم نے بار بار روکا اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا، اور اس کے خلاف کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھ آدمیوں پر میں لعنت کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ بھی اُن پر لعنت کرے، ایک وہ شخص جس نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا (یعنی خواہ کچھ الفاظ بڑھا دیئے یا معنی میں ایسی زیادتی کر دی جو تفسیر صحابہ کے خلاف ہے) دوسرے وہ شخص جو تقدیرِ الٰہی کا منکر ہو گیا، تیسرے وہ شخص جو اُمت پر زبردستی مسلط ہو جائے تاکہ عزت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہے اور ذلت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے عزت دی ہے، چوتھے وہ شخص جس نے اللہ کے حرام کو حلال سمجھا، یعنی حرم مکہ میں قتل و قتال کیا، یا شکار کھیلا، پانچویں وہ شخص جس نے میری عترت و اولاد کی بے حرمتی کی، چھٹے وہ شخص جس نے میری سنت کو چھوڑ دیا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔

پچھلی آیت میں اس کا بیان تھا کہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہونے والوں کو روزِ قیامت میں اللہ تعالیٰ ہی ان کے اعمال کی سزا دیں گے۔

اس آیت میں آخرت کی جزا و سزا کا کریمانہ ضابطہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص ایک نیک کام کرے گا اس کو دس گنا بدلہ دیا جائے گا، اور جو ایک گناہ کرے گا اس کا بدلہ صرف ایک گناہ کی برابر دیا جائے گا۔

صحیح بخاری اور مسلم، نسائی اور مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا رب عزوجل رحیم ہے، جو شخص کسی نیک کام کا صرف ارادہ کرے اس کے لئے ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے، خواہ عمل کرنے کی نوبت بھی نہ آئے، پھر جب وہ اس نیک کام کو کرلے، تو دس نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں، اور جو شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے، مگر پھر اس پر عمل نہ کرے تو اس کے لئے بھی ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے، اور گناہ کا عمل بھی کرے تو ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے، یا اس کو بھی مٹا دیا جاتا ہے، اس عفو و کرم کے ہوتے ہوئے اللہ کے دربار میں وہی شخص ہلاک ہو سکتا ہے جس نے ہلاک ہونے ہی کی ٹھان رکھی ہے (ابن کثیر)

ایک حدیث قدسی میں بروایت ابوذرؓ ارشاد ہے:

"جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، اور اس سے بھی زیادہ، اور جو شخص ایک گناہ کرتا ہے تو اس کی سزا صرف ایک ہی گناہ کی برابر ملے گی، یا میں اس کو بھی معاف کر دونگا اور جو شخص اتنے گناہ کر کے میرے پاس آئے جن سے ساری زمین بھر جائے اور مغفرت کا طالب ہو تو میں اتنی ہی مغفرت سے اس کے ساتھ معاملہ کروں گا، اور جو شخص میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں، اور جو شخص ایک ہاتھ میری طرف آتا ہے میں اس کی طرف بقدر ایک باع کے آتا ہوں (باع کہتے ہیں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کو) اور جو شخص میری طرف جھپٹ کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں"

ان روایات حدیث سے معلوم ہوا کہ نیکی کی جزا میں دس تک کی زیادتی جو اس آیت میں مذکور ہے ادنیٰ حد کا بیان ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے اس سے زیادہ بھی دے سکتے ہیں اور دیں گے، جیسا کہ دوسری روایات سے ستر گنا یا سات سو گنا تک ثابت ہوتا ہے۔

اس آیت کے الفاظ میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہاں لفظ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فرمایا ہے عَمِلَ بِالْحَسَنَةِ نہیں فرمایا، تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ محض کسی نیک یا بد کام کر لینے پر یہ جزا و سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ جزا و سزا کے لئے موت کے وقت تک اس عمل نیک یا بد عمل کا قائم رہنا شرط ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی نیک عمل کیا، لیکن پھر اس کے کسی گناہ کی شامت سے وہ عمل حبط اور ضائع ہو گیا تو وہ اس عمل پر جزا کا مستحق نہیں رہا، جیسے معاذ اللہ کفر و شرک تو سارے ہی اعمالِ صالحہ کو برباد کر دیتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے گناہ ایسے ہیں جو بعض اعمالِ صالحہ کو باطل اور بے اثر کر دیتے ہیں، جیسے قرآن کریم میں ہے لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى، یعنی تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر یا ایذا پہونچا کر باطل اور ضائع نہ کرو"

اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ کا عملِ صالح احسان جتانے یا ایذا پہنچانے سے باطل اور ضائع ہو جاتا ہے، اسی طرح حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں جو اعمالِ صالحہ نوافل اور تسبیح وغیرہ کے کئے ہیں، وہ دنیا کی باتیں کرنے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح بُرے اعمال سے اگر توبہ کر لی تو وہ گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے، موت کے وقت تک باقی نہیں رہتا، اس لئے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ "جو کوئی عمل کرے نیک یا بد تو اس کو جزا یا سزا ملے گی" بلکہ یوں فرمایا کہ "جو شخص ہمارے پاس لائے گا نیک عمل تو دس گنا

ثواب پائیگا اور ہمارے پاس لائے گا برا عمل تو ایک ہی عمل کی سزا پاوے گا۔ اللہ تعالیٰ کے پاس لانا اسی وقت ہوگا جب یہ عمل آخر تک قائم اور باقی رہے، نیک عمل کو ضائع کرنے والی کوئی چیز پیش نہ آوے اور برے عمل سے توبہ و استغفار نہ کرے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ، یعنی اس عدالتِ عالیہ میں اس کا امکان نہیں کہ کسی پر ظلم ہو سکے، نہ کسی کے نیک عمل کے بدلے میں کمی کا امکان ہے، نہ کسی کے برے عمل میں اس سے زائد سزا کا احتمال ہے۔

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ
تو کہہ دے مجھ کو سمجھائی میرے رب نے راہ سیدھی دین صحیح ملتِ ابراہیم

إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٦١﴾ قُلْ إِنَّ
کی جو ایک ہی طرف کا تھا اور نہ تھا شرک کرنے والوں میں، تو کہہ میری

صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾
نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا ہے،

لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾
کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں،

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ
تو کہہ کیا اب میں اللہ کے سوا تلاش کروں کوئی رب اور وہی ہے رب ہر چیز کا اور جو کوئی گناہ کرتا ہے

كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ
سو وہ اس کے ذمہ پر ہے، اور بوجھ نہ اٹھائے گا ایک شخص دوسرے کا پھر

إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿١٦٤﴾
تمہارے رب کے پاس ہی سب کو لوٹ کر جانا ہے، سو وہ جتلا دیگا جس بات میں تم جھگڑتے تھے،

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ
اور اسی نے تم کو نائب کیا ہے زمین میں اور بلند کر دیئے تم میں درجے ایک

بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ
کے ایک پر تاکہ آزمائے تم کو اپنے دیئے ہوئے حکموں میں، تیرا رب جلد

الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٥﴾ ع
عذاب کرنیوالا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے

ع ۲۰ / ۱۱ — انعام

خلاصۂ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا رستہ (وحی کے ذریعہ سے) بتلا دیا ہے کہ وہ ایک دین ہے (جو بوجہ ثبوت بدلائل کے مستحکم ہے) جو طریقہ ہے ابراہیم (علیہ السلام) کا جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ (ابراہیمؑ) شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (اور) آپ (اس دین مذکور کی قدرے تفصیل کے لئے) فرما دیجئے کہ (اس دین کا حاصل یہ ہے کہ) بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کے لئے ہے جو مالک ہے سارے جہان کا، اس کا (استحقاقِ عبادت یا تصرفاتِ ربوبیت میں) کوئی شریک نہیں، اور مجھ کو اسی (دین مذکور پر رہنے) کا حکم ہوا ہے اور (حکم کے موافق) میں (اس دین والوں میں) سب ماننے والوں سے پہلا (ماننے والا) ہوں، آپ (ان باطل کی طرف بلانے والوں سے) فرما دیجئے کہ کیا (بعد وضوحِ حقیقتِ توحید و اسلام کے تمہارے کہنے سے) میں خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں (یعنی نعوذ باللہ شرک اختیار کر لوں) حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا (اور سب چیزیں اس کی مملوک ہیں اور مملوک شریکِ مالک نہیں ہو سکتا) اور (تم جو کہتے ہو کہ تمہارا گناہ ہمارے سر سو یہ محض لغویات ہے کہ کرنے والا پاک صاف رہے اور صرف دوسرا گنہگار ہو جاوے، بلکہ بات یہ ہے کہ) جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے، اور کوئی دوسرے کا بوجھ (گناہ کا) نہ اٹھاوے گا (بلکہ سب اپنی اپنی بھگتیں گے) پھر (سب کے عمل کر چکنے کے بعد) تم سب کو اپنے رب کے پاس جانا ہوگا، پھر وہ تم کو جتلا دیں گے جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے (کہ کوئی کسی دین کو حق بتلاتا تھا اور کوئی کسی کو، وہاں عملی اطلاع سے فیصلہ کر دیا جاوے گا، کہ اہلِ حق کو نجات اور اہلِ باطل کو سزا ہوگی) اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحبِ اختیار بنایا (اس نعمت میں تو سب شامل ہے) اور ایک کا دوسرے پر (مختلف چیزوں میں) رتبہ بڑھایا، (اس نعمت میں تفاضل ہے) تاکہ (ان نعمتوں سے) تم کو (ظاہراً) آزماوے ان چیزوں میں جو کہ (نعم مذکورہ سے) تم کو دی ہیں (آزمانا یہ کہ کون ان نعمتوں کی قدر کر کے منعم کی اطاعت کرتا ہے اور کون بے قدری کر کے اطاعت نہیں کرتا، پس بعضے مطیع ہوئے، بعضے نافرمان ہو گئے اور دونوں کے ساتھ مناسب معاملہ کیا جاوے گا، کیونکہ) بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا (بھی) ہے، اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا، مہربانی کرنے والا (بھی) ہے،

دلیں نافرمانوں کے لئے عقاب ہو اور فرمانبرداروں کے لئے رحمت ہو، اور نافرمانی سے فرمانبرداری کی طرف آنے والوں کے لئے مغفرت ہے، پس مکلفین پر ضرور ہوا کہ دین حق کے موافق اطاعت اختیار کریں، اور باطل اور مخالفت حق سے باز آویں) ۞

معارف ومسائل

یہ سورۂ انعام کی آخری چھ آیتیں ہیں، جن لوگوں نے دینِ حق میں افراط و تفریط اور کمی بیشی کر کے مختلف دین بنالئے تھے، اور خود مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے تھے، ان کے مقابلہ پر ان میں سے پہلی تین آیتوں میں دینِ حق کی صحیح تصویر، اس کے بنیادی اصول اور بعض اہم فروع و جزئیات بیان کئے گئے ہیں، پہلی دو آیتوں میں اصول کا بیان ہے اور تیسری آیت میں ان کے اہم فروع کا ذکر ہے، اور دونوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ ارشاد ہوا ہے کہ آپ ان لوگوں کو یہ بات پہونچا دیں۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے، قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ "یعنی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتادیا ہے"، اس میں اشارہ فرما دیا کہ میں نے تمہاری طرح اپنے خیالات یا آبائی رسوم کے تابع یہ راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ میرے رب نے مجھے یہ راستہ بتایا ہے، اور لفظ "رب" سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس کی شانِ ربوبیت کا تقاضا ہو کہ وہ صحیح راستہ بتائے، تم بھی اگر چاہو تو اس کی طرف ہدایت کے سامان تمہارے لئے بھی موجود ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ اس میں لفظ "قِیَم" مصدر ہو، قیام کے معنی میں، اور مراد اس سے قائم رہنے والا مستحکم ہے، یعنی یہ دین مستحکم ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، کسی کے شخصی خیالات نہیں، اور کوئی نیا دین و مذہب بھی نہیں جس میں کسی کو شبہ ہو سکے، بلکہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی دین ہے، خصوصیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام اس لئے ذکر فرمایا کہ دنیا کے ہر مذہب والے ان کی عظمت و امامت کے قائل ہیں، موجودہ فرقوں میں سے یہود، نصاریٰ، مشرکینِ عرب آپس میں کتنے ہی مختلف ہوں مگر ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی و امامت پر سب ہی متفق ہیں، یہی وہ مقامِ امامت ہو جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعام کے طور پر ان کو دیا ہے اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط

پھر ان میں سے ہر فرقہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ ہم دینِ ابراہیمی پر قائم ہیں، اور ہمارا مذہب ہی ملتِ ابراہیم ہے، ان کے اس مغالطہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام تو غیر اللہ کی عبادت سے پرہیز کرنے والے اور شرک سے نفرت کرنے والے

تھے، اور یہی ان کا سب سے بڑا شاہکار ہے، تم لوگ جبکہ شرک میں مبتلا ہو گئے تو یہود نے حضرت عُزیر علیہ السلام کو، نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور مشرکینِ عرب نے ہزاروں پتھروں کو خدائی کا شریک مان لیا، تو پھر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں رہا کہ وہ ملتِ ابراہیمی کا پابند ہے، ہاں یہ حق صرف مسلمان کو پہونچتا ہے جو شرک و کفر سے بیزار ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس میں لفظ "نُسُک" کے معنی قربانی کے بھی آتے ہیں، اور حج کے ہر فعل کو بھی نُسُک کہتے ہیں، اعمالِ حج کو "مناسک" کہا جاتا ہے، اور یہ لفظ مطلق عبادت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، اسی لئے ناسک بمعنی عابد بولا جاتا ہے، اس جگہ ان میں سے ہر ایک معنی مراد لئے جا سکتے ہیں، اور مفسرین صحابہ و تابعین سے یہ سب تفسیریں منقول بھی ہیں، مگر مطلق عبادت کے معنی اس جگہ زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں، معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ میری نماز اور میری تمام عبادات اور میری پوری زندگی اور پھر موت یہ سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔

اس میں فروعِ اعمال میں سے اوّل نماز کا ذکر کیا، کیونکہ وہ تمام اعمالِ صالحہ کی روح اور دین کا عمود ہے، اس کے بعد تمام اعمال و عبادات کا اجمالی ذکر فرمایا، اور پھر اس سے ترقی کر کے پوری زندگی کے اعمال و احوال کا ذکر کیا، اور آخر میں موت کا، ان سب کا ذکر کر کے فرمایا کہ ہماری یہ سب چیزیں صرف اللہ رب العالمین کے لئے ہیں، جس کا کوئی شریک نہیں، اور یہی ایمانِ کامل اور اخلاص کامل کا نتیجہ ہے، کہ انسان اپنی زندگی کے ہر حال میں اور ہر کام میں اس کو پیشِ نظر رکھے کہ میرا اور تمام جہان کا ایک رب ہو، میں اس کا بندہ اور ہر وقت اس کی نظر میں ہوں، میرا قلب، دماغ، آنکھ، کان، زبان اور ہاتھ پیر، قلم اور قدم اس کی مرضی کے خلاف نہ اٹھنا چاہئے، یہ وہ مراقبہ ہو کہ اگر انسان اس کو اپنے دل دماغ میں مستحضر کر لے تو صحیح معنی میں انسان اور کامل انسان ہو جائے، اور گناہ و معصیت اور جرائم کا اس کے آس پاس بھی گذر نہ ہو۔

تفسیر درِ منثور میں اسی آیت کے تحت میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اس آیت کو بار بار پڑھا کرے اور اس کو وظیفۂ زندگی بنالے۔

اس آیت میں نماز اور تمام عبادات کا اللہ کے لئے ہونا تو ظاہر ہے کہ ان میں شرک یا ریاء یا کسی دنیوی مفاد کا دخل نہ ہونا مراد ہے، اور زندگی اور موت کا اللہ کے لئے ہونا، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری موت و حیات ہی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، تو پھر زندگی کے اعمال و عبادات بھی اسی کے لئے ہونا لازم ہے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جتنے اعمال زندگی سے

وابستہ ہیں وہ بھی صرف اللہ کے لئے ہیں، جیسے نماز، روزہ اور لوگوں کے ساتھ معاملات کے حقوق و فرائض وغیرہ اور جو اعمال موت سے متعلق ہیں، یعنی وصیت اور اپنے بعد کے لئے جو ہر انسان کوئی نظام چاہتا اور سوچتا ہے، وہ سب اللہ ربّ العالمین کے لئے اور اسی کے احکام کے تابع ہے۔

پھر فرمایا وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی قول و قرار اور اخلاصِ کامل کا حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلا فرمانبردار مسلمان ہوں، مراد یہ ہے کہ اس امت میں سب سے پہلا مسلمان میں ہوں، کیونکہ ہر اُمت کا پہلا مسلمان خود وہ نبی یا رسول ہوتا ہے جس پر وحیِ شریعت نازل کی جاتی ہے۔

اور پہلا مسلمان ہونے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ مبارک پیدا کیا گیا ہے، اس کے بعد تمام آسمان و زمین اور مخلوقاتِ وجود میں آئے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے، اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰى نُوْرِيْ (روح المعانی)

کسی کے گناہ کا بار دوسرا نہیں اٹھا سکتا

چوتھی آیت میں مشرکینِ مکہ ولید بن مغیرہ وغیرہ کی اس بات کا جواب ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ، تو تمہارے سارے گناہوں کا بار ہم اٹھالیں گے، اس پر فرمایا قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ کیا تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ تمہاری طرح میں بھی اللہ کے سوا کوئی اور ربّ تلاش کرلوں، حالانکہ وہی سارے جہان اور ساری کائنات کا رب ہے، اس گمراہی کی مجھ سے کوئی امید نہ رکھو، باقی تمہارا یہ کہنا کہ ہم تمہارے گناہوں کا بار اٹھالیں گے یہ خود ایک حماقت ہے، گناہ تو جو شخص کرے گا اسی کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا، اور وہی اس کی سزا کا مستحق ہوگا، تمہارے اس کہنے سے وہ گناہ تمہاری طرف کیسے منتقل ہو سکتا ہے، اور اگر یہ خیال ہو کہ حساب اور نامۂ اعمال میں تو انہی کے رہے گا لیکن میدانِ حشر میں اس پر جو سزا مرتب ہوگی وہ سزا ہم بھگت لیں گے، تو اس خیال کو بھی اس آیت کے اگلے جملہ نے رد کر دیا، فرمایا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى، یعنی قیامت کے روز کوئی شخص دوسرے کا بارِ گناہ نہیں اٹھائے گا۔

اس آیت نے مشرکین کے بیہودہ قول کا جواب تو دیا ہی ہے، عام مسلمانوں کو یہ ضابطہ بھی بتلا دیا کہ قیامت کے معاملہ کو دنیا پر قیاس نہ کرو کہ یہاں کوئی شخص جرم کر کے کسی دوسرے کے سر ڈال سکتا ہے، خصوصاً جبکہ دوسرا خود رضامند بھی ہو، مگر عدالتِ الٰہیہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، وہاں ایک کے گناہ میں دوسرا ہرگز نہیں پکڑا جا سکتا، اسی آیت سے استدلال فرما کر

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ولد الزنا پر والدین کے جرم کا کوئی اثر نہیں ہوگا، یہ حدیث حاکم نے بسندِ صحیح حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کی ہے۔

اور ایک میت کے جنازہ پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ زندوں کے رونے سے مُردہ کو عذاب ہوتا ہے، ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ قول حضرت عائشہ رضؓ کے سامنے نقل کیا تو انھوں نے فرمایا کہ تم ایک ایسے شخص کا یہ قول نقل کر رہے ہو جو نہ کبھی جھوٹ بولتا ہے اور نہ اُن کی ثقاہت میں کوئی شبہ کیا جا سکتا ہے، مگر کبھی سننے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے، اس معاملہ میں تو قرآن کا ناطق فیصلہ تمہارے لئے کافی ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى، "یعنی ایک کا گناہ دوسرے پر نہیں پڑ سکتا، تو کسی زندہ آدمی کے رونے سے مردہ بے تصور کس طرح عذاب میں ہو سکتا ہے (درمنثور)

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ "پھر تم سب کو بالآخر اپنے رب ہی کے پاس جانا ہے، جہاں تمہارے سارے اختلاف کا فیصلہ سنا دیا جائے گا"، مطلب یہ ہے کہ زبان آوری اور کج بحثی سے باز آؤ، اپنے انجام کی فکر کرو۔

پانچویں اور چھٹی آیت میں ایک جامع نصیحت پر سورۂ انعام کو ختم کیا گیا ہے، اور وہ عہدِ ماضی کی تاریخ اور پچھلی قوموں کی سرگذشت کو ان کے سامنے لا کر اپنے مستقبل کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے: وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ اس میں لفظ خلائف، خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کسی کا قائم مقام اور گدی نشین، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو تم سے پہلی قوموں کی جگہ پر آباد کیا ہے، کوئی مکان زمین جس کو آج تم اپنی ملکیت کہتے ہو اور سمجھتے ہو ایسا نہیں جو کل تمہیں جیسے دوسرے انسانوں کی ملکیت میں نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہٹا کر تمہیں ان کی جگہ بٹھایا ہے، اور پھر یہ بات بھی ہر وقت قابلِ غور ہے کہ تم میں بھی سب آدمی یکساں نہیں، کوئی مفلس ہے کوئی مال دار، کوئی ذلیل ہے کوئی عزت دار، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر مال داری اور عزت خود انسان کے اختیار میں ہوتی تو کونسا انسان مفلسی اور ذلت کو اختیار کرتا، یہ درجات کا تفاوت بھی تمہیں اس کی خبر دے رہا ہے کہ اختیار کسی اور ہستی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسکو چاہے مفلس کر دے جسکو چاہے مال دار، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت۔

آخر آیت میں فرمایا لِيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ، یعنی تمہیں دوسرے لوگوں کی جگہ بٹھانے اور ان کے مال جائداد کا مالک بن جانے اور پھر عزت و دولت کے اعتبار سے مختلف درجات میں رکھنے سے مقصد یہی ہے کہ تمہاری آنکھیں کھلیں اور اس کا امتحان ہو کہ جو نعمتیں پچھلے لوگوں کو ہٹا کر